Dr. Rabia Sarfaraz
Chair-Person, Dept. of Urdu, Govt.
College University Faisalabad

ڈاکٹر رابعہ سرفراز
چیئرپرسن شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

پاکستانی اردو افسانے پر دہشت گردی کے اثرات: ایک تجزیاتی مطالعہ

The Impact of Terrorism on Pakistani Urdu Fiction: An Analytical Study

Abstract: Terrorism is framed not merely as physical destruction but as an erosion of humanity’s "spiritual essence." Writers like Manto and Muhammad Hameed Shahid depict survivors as hollow beings—"living corpses" who breathe but lack inner vitality, symbolizing the annihilation of hope and moral purpose. Ahmad Nadeem Qasmi situates terrorism at the intersection of social fragmentation and moral decay, portraying it as a crisis of human identity. Manto’s characters navigate landscapes of fear and instability, where trust and relationships disintegrate Shahid illustrates how terrorism’s deep wounds seep into society’s veins, corrupting communal bonds and fostering pervasive distrust. Writers like Asghar Nadeem Syed and Noor-ul-Huda Shah amplify the hollowness and restlessness of urban life under terror. Their characters’ anxieties mirror the chaos of cities under siege, where terror infiltrates both physical spaces and mental sanctuaries. These short stories conclude that terrorism’s lasting damage is not material ruin but the extinguishing of humanity’s spirit. Qasmi uses geopolitical partition to symbolize fractured psyches and societal disintegration. Pakistani Urdu fiction reframes terrorism as a cultural autopsy, revealing how violence corrodes the soul long after physical battles end. This analysis underscores how Urdu literature transforms terrorism from a geopolitical narrative into a universal exploration of human fragility and resilience.

Keywords: Urdu Short stories, Terrorism, Pakistani Short stories, Spiritual Death, Psychological Trauma, Identity Fragmentation.

ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ جب کوئی معاشرہ بحران یا تبدیلی سے گزرتا ہے تو اس کے اثرات اس کے ادب، بالخصوص افسانے پر گہرے انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں پاکستان میں دہشت گردی کی جس لہر نے جنم لیا، اس نے نہ صرف عام زندگی کو متاثر کیا بلکہ فنونِ لطیفہ پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو افسانہ نگاروں نے دہشت گردی کو محض ایک خبر یا سانحے کے طور پر نہیں بلکہ انسانی نفسیات، معاشرتی ساخت، اور ریاستی توازن کی ایک مکمل تصویر کے طور پر بیان کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانے انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے انھیں چیرتے ہیں تاکہ معاشرے کی بے حسّی کو للکارا جاسکے۔ دہشت گردی، تشدّد، اور فرقہ وارانہ فسادات کے اثرات اُن کے کرداروں کی نفسیات، رویوں، اور سماجی رشتوں میں اُبھر کر آتے ہیں۔ یہ مضمون منٹو کے افسانوں سے اقتباسات کو سامنے رکھتے ہوئے دہشت گردی کے اثرات کا جائزہ پیش کرتا ہے:

"میں نے اُسے مار ڈالا... کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ مرنے سے پہلے ہی مر
چکی تھی۔ وہ زندہ لاش تھی... اُس کا گوشت ٹھنڈا تھا۔"(۱)

کلیم کا یہ اعتراف دہشت گردی کی نفسیاتی پیچیدگی کو عیاں کرتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے اُس کے اندر کے انسان کو مار ڈالا، جس کے بعد وہ اپنی محبوبہ کو قتل کرنے پر مجبور ہوا۔ "ٹھنڈا گوشت" کی علامت محض جسمانی موت نہیں بلکہ جذباتی موت کی طرف اشارہ ہے۔ دہشت گردی نے کلیم کو ایک ایسا مجرم بنا دیا جو اپنے ہاتھوں سے محبت کو کھونے پر بھی بے حسّ ہو چکا تھا:

"جب سکینہ کو کھینچ کر باہر لایا گیا تو اُس کے باپ نے اُس کی آنکھوں میں
ڈوبتی ہوئی زندگی کو دیکھا... اُس نے چپکے سے کہا: 'کھول دو'۔"(۲)

سکینہ کے ساتھ اجتماعی تشدّد کا یہ واقعہ دہشت گردی کی سب سے بھیانک شکل کو ظاہر کرتا ہے۔ باپ کا "کھول دو" کہنا صرف کفن کو نہیں بلکہ اُس معاشرے کی اخلاقی موت کو کھولنے کی استدعا ہے جو خواتین کی عصمت کو جنگ کا ہتھیار سمجھتا ہے۔ منٹو نے اس اقتباس کے ذریعے دہشت گردی کے بعد معاشرے میں پھیلنے والی خاموشی اور بے حسّی کو چیلنج کیا ہے:

"بشن سنگھ نے اپنی آخری سانس تک یہی دہرایا: 'اوپر دی گڑ گڑ دی
annex دی bedhiyana دی مونگ دی دال!'"(۳)

تقسیمِ ہند کے تناظر میں بشن سنگھ کی یہ بے معنی پکار دہشت گردی کی نظریاتی جہالت کو بے نقاب کرتی ہے۔ سرحدوں کی تقسیم نے انسانوں کو پاگل بنا دیا، جبکہ پاگل خانے کے باشندے ہی حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ منٹو کا یہ اقتباس دہشت گردی کو جغرافیائی حد بندیوں سے آگے ایک ذہنی بیماری کے طور پر پیش کرتا ہے۔

"پروین نے چولہے کی راکھ کو ہاتھ میں لیا... 'یہ دھواں کب تک اُٹھتا رہے
گا؟' اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔"(۴)

دہشت گردی میں شوہر کی موت کے بعد پروین کی زندگی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "دھواں" کی علامت صرف غم ہی نہیں بلکہ معاشرے کی تباہ شدہ امیدوں کی طرف اشارہ ہے۔ منٹو نے اس اقتباس میں دہشت گردی کے طویل المدتی اثرات کو اجاگر کیا ہے جو متاثرین کو عمر بھر جلتے ہوئے سوالات میں گم کر دیتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں دہشت گردی کا اثر صرف خون خرابے تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کی روح تک کو جھلسا دیتا ہے۔ اُن کے اقتباسات میں دہشت گردی کے بعد پیدا ہونے والی خاموشی، بے حسّی، اور نفسیاتی کرب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ آج بھی جب ہم دہشت گردی کے نئے چیلنجز کا سامنا کر رہے ہیں، منٹو کا ادب ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تشدّد کا سب سے بڑا نشانہ انسانیت کا ضمیر ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دہشت گردی کے اثرات کو سماجی انتشار، نفسیاتی تکالیف، اور انسانی اقدار کے زوال کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ قاسمی کا فن معاشرے کے نچلے طبقوں کی کہانیوں کو بیان کرنے میں ماہر ہے، اور ان کے بیشتر افسانوں میں تشدّد، خوف، اور عدم استحکام کے موضوعات نمایاں ہیں۔ ذیل میں ان کے چند افسانوں سے اقتباسات اور تجزیہ پیش کیا جاتا ہے:

"پورا گاؤں ویران تھا۔ کچھ دیواریں گر چکی تھیں، کچھ کے سائے بچے تھے۔۔۔ لوگوں کے چہروں پر خوف تھا، جیسے ہر لمحہ کوئی آفت آنے والی ہو۔ بچوں کی آنکھوں میں سوال تھا کہ ہم کس قصور کی سزا بھگت رہے ہیں؟"(۵)

یہ اقتباس دہشت گردی کے بعد کے منظر نامے کو واضح کرتا ہے جہاں معاشرتی ساخت تباہ ہو چکی ہے۔ لوگوں کے چہروں پر خوف اور بچوں کی معصوم آنکھوں میں سوالات، دہشت گردی کے طویل المدتی نفسیاتی اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ قاسمی یہاں سماجی عدم تحفظ اور انسانی حقوق کی پامالی کو اجاگر کرتے ہیں:

"وہ دن بھر کپاس چنتی رہی، مگر اس کے ہاتھوں میں خون کے دھبے تھے۔۔۔ باپ کی لاش گلی میں پڑی تھی، اور ماں کی چیخیں ہوا میں گم ہو رہی تھیں۔ کپاس کا پھول سفید تھا، مگر اس کی زندگی کالے دھبوں سے بھر گئی تھی"(۶)

دہشت گردی کی صورت میں خواتین اور بچوں پر پڑنے والے اثرات کو اس اقتباس میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "کپاس کا پھول" معصومیت کی علامت ہے جو تشدّد کی وجہ سے کالے دھبوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قاسمی یہاں دہشت گردی کے نتیجے میں خاندانی نظام کے ٹوٹنے اور معاشی بدحالی کو بھی واضح کرتے ہیں:

""سناٹا اتنا گہرا تھا کہ سانس لینے کی آواز بھی دب جاتی تھی۔۔۔ دروازے پر دستک ہوئی تو سب کے چہرے فق ہو گئے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ یہ امید کی آواز ہے یا موت کا پیغام۔"(۷)

دہشت گردی کے دوران پیدا ہونے والا خوف اور عدم اعتماد اس اقتباس میں عیاں ہے۔ "سناٹا" دراصل سماجی خاموشی اور بے حسّی کی علامت ہے جہاں لوگ اپنے ہی گھروں میں قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ قاسمی یہاں دہشت گردی کے سیاسی اور سماجی محرکات کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دہشت گردی کے اثرات کو کئی سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے :

۱۔ نفسیاتی اثرات: خوف، بے چینی، اور عدم تحفظ کا احساس۔

۲۔ سماجی اثرات: خاندانوں کا بکھراؤ، معاشرتی رشتوں کا ٹوٹنا، اور معاشی بدحالی۔

۳۔ اخلاقی اثرات: انسانی اقدار کا زوال اور تشدّد کی معمولیت۔

قاسمی کا انداز بیانیہ علامتوں اور سادہ زبان پر مبنی ہے، جو قاری کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ وہ دہشت گردی کو صرف ایک واقعہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک "سماجی بیماری" کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کی جڑیں عدم مساوات اور ناانصافی میں ہیں۔

حسن منظر کے افسانوں کا محور انسانی المیے ہیں، خاص طور پر وہ معاشرے جہاں دہشت گردی، تشدّد، اور عدم استحکام نے انسانی رشتوں کو تہہ و بالا کر دیا ہو۔ اُن کے افسانے نہ صرف واقعات کو بیان کرتے ہیں بلکہ دہشت کے بعد کے سماج کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک ایسے شہر کی کہانی ہے جو دہشت گردی کے خوف میں گھِر چکا ہے۔ مرکزی کردار "عارف" ایک اسکول ٹیچر ہے جو اپنے طلباء کو دہشت گردی کے خلاف آگاہی دیتا ہے، مگر ایک دھماکے میں اپنی بیٹی کو کھو دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھڑی کی ٹکٹاک (وقت کی رفتار) اور خوف کے درمیان جیتا ہے۔ گھڑی کی آواز (ٹکٹاک) دہشت گردی کے مسلسل خوف کی علامت ہے۔ عارف کی بیٹی کی موت نے اُسے ایک خاموش احتجاج کی صورت میں بدل دیا ہے:

> "عارف نے گھڑی کو دیوار سے اتار کر زمین پر پھینک دیا... مگر ٹکٹاک اب
> اُس کے دماغ میں تھی۔"(۸)

دھماکے کے بعد لوگوں کا "خاموشی سے راستہ صاف کرنا" سماج کی بے حسّی اور دہشت کے سامنے جھک جانے کو ظاہر کرتا ہے۔ "خون کے آنسو" یہ افسانہ کشمیر میں دہشت گردی کے پس منظر میں ایک ماں اور اُس کے بیٹے کی کہانی ہے جو فوجی آپریشن میں مارا جاتا ہے۔ ماں "زینب" اپنے بیٹے کی لاش پر خون کے آنسو روتی ہے، جو اُس کی بے بسی اور ریاستی تشدّد کے خلاف علامتی احتجاج ہے۔ فوجی آپریشنز اور دہشت گردی کے درمیان عام لوگوں کی بے بسی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

> "زینب کے آنسوؤں میں خون کی سرخی تھی... یہ آنسو نہیں، سوال
> تھے۔"(۹)

بیٹے کی موت نے زینب کو احساسِ زیاں کے سمندر میں ڈبو دیا۔

"شہرِ بے مثال" افسانہ ایک ایسے شہر کی علامتی کہانی ہے جو دہشت گردی کی وجہ سے *خوابوں کی سرزمین سے ویرانوں کا شہر بن چکا ہے۔ مرکزی کردار "سلیم" اپنے ماضی کے شہر کو تلاش کرتا ہے، مگر ہر طرف صرف کھنڈر اور خوف نظر آتا ہے۔ شہر کی تباہی دراصل تہذیب کی موت کی علامت ہے:

> "شہرِ بے مثال کی اینٹیں اب دہشت کے سوا کچھ نہیں بولتیں۔"(۱۰)

"گھڑی کی ٹک ٹاک" وقت کی بے رحمی اور دہشت کی مسلسل موجودگی کا اظہار ہے۔ "خون کے آنسو" انسانی المیے کا احتجاجی اظہار ہے اور "شہر بے مثال" تہذیب کی شکست کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ حسن منظر نے دہشت گردی کو انسانی نفسیات کی گہرائی سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں دہشت صرف واقعات تک محدود نہیں، بلکہ سماجی بیماری ہے جو فرد اور معاشرے کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ تاہم، کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ اُن کے کرداروں کے مکالمے بعض اوقات بہت زیادہ فلسفیانہ ہو جاتے ہیں، جو عام قاری کے لیے پیچیدہ ہو سکتے ہیں۔

اردو ادب میں جب بھی عصری مسائل اور انسان کی داخلی کیفیات کو ادبی قالب میں ڈھالنے کی بات کی جاتی ہے تو محمد حمید شاہد کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے "مرگزار" میں دہشت گردی جیسے نازک اور سنگین موضوع کو جس حساسیت، فنی باریکی اور انسانی زاویے سے پیش کیا گیا ہے، وہ نہ صرف ان کی تخلیقی بصیرت کا مظہر ہے بلکہ اردو افسانے کے دامن کو بھی وسعت عطا کرتا ہے۔ افسانہ "مرگ زار" میں ایک بم دھماکے کے بعد کی فضا کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "پھٹے گوشت کی باس تھی، جیسے کسی نے چیر کر رکھ دیا ہو، اور چیخیں... ہر
> طرف چیخیں تھیں، ایک لمحہ جیسے کئی برسوں پر محیط ہو گیا ہو۔" (۱۱)

یہ اقتباس اس ذہنی صدمے کا اظہار ہے جو دہشت گردی کے واقعے کے بعد انسان کے حواس پر چھا جاتا ہے۔ کردار دھماکے کے بعد اس قدر گم سم ہے کہ وقت کا احساس مٹ جاتا ہے۔ افسانہ "نکوکاری" میں ایک شہری کی زبان سے مصنف لکھتے ہیں:

> "ہمیں نہیں معلوم کہ مجرم کون ہے، مگر ہمیں معلوم ہے کہ ہم سب سزا
> بھگت رہے ہیں۔ نیند اُڑ گئی ہے، جیسے خوف ہماری چھت پر آن بیٹھا ہو۔"
> (۱۲)

یہ اقتباس نہ صرف اجتماعی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ اس خوف کو بھی ظاہر کرتا ہے جو ہر فرد کے اندر گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ افسانہ "آخری خواہش" میں خودکش حملہ آور کی نفسیاتی حالت کو بیان کرتے ہوئے لکھا گیا۔ افسانہ "سعادت" میں دہشت کے اثرات اس طرح دکھائے گئے ہیں:

> دیواروں کے سائے بھی اب مجھے دھمکی دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ دھماکے کے
> بعد جو لمحے باقی بچے، وہ جینے کے نہیں تھے، صرف کاٹنے کے تھے۔" (۱۳)

یہ جملے قاری کو احساس دلاتے ہیں کہ دہشت گردی صرف موت کا پیغام نہیں، بلکہ جو بچ جاتے ہیں وہ بھی زندہ نہیں رہتے، بس سانس لیتے ہیں۔ محمد حمید شاہد کا افسانوی مجموعہ "مرگ زار" اردو ادب میں دہشت گردی کے اثرات پر لکھا گیا ایک فکر انگیز بیانیہ ہے جو نہ صرف ہماری سماجی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے بلکہ انسان کی داخلی دنیا کی گہرائیوں میں جھانکنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ہر افسانہ قاری کو نہ صرف ایک کہانی سناتا ہے بلکہ اس میں اس کی اپنی زندگی کی جھلک دکھاتا ہے۔ "مرگ زار" اس لحاظ سے اردو افسانے میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے کہ اس میں دہشت

گردی کو صرف سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی مسئلہ کے طور پر دیکھا گیا ہے، جس کے گہرے نفسیاتی اثرات مصنف نے فنی سچائی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ محمد حمید شاہد کا افسانوی مجموعہ مرگ زار اردو ادب میں دہشت گردی کی عکاسی کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ ان کے افسانے "سائے" میں دہشت گردی سے جنم لینے والے نفسیاتی اضطراب کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے:

"ہم اپنے ہی گھروں میں یرغمال تھے، دروازوں کے پیچھے، کھڑکیوں کی اوٹ
میں، سانسیں روک کر جینے کی کوشش میں۔" (۱۴)

یہ محض دہشت گردی کا بیان نہیں بلکہ اُس خوف، اذیت، اور جبر کا بیانیہ ہے جو روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔

اردو کے معروف افسانہ نگار اصغر ندیم سید، اپنے افسانوں میں دہشتگردی کے اثرات کو بہت خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پیدا ہونے والی دہشت، خوف، اور تشویش کی عکاسی ہوتی ہے، جو کہ موجودہ دور کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ اصغر ندیم سید کے افسانے "آخری مارچ" میں ایک کردار کی آواز میں کہا گیا ہے:

"آج کل ہمارے شہر میں کچھ ایسا ہو رہا ہے جس سے ہم سب ڈرے ہوئے
ہیں۔ آپ کو بتا دوں کہ یہ بہت خطرناک ہے۔ کوئی بھی کسی سے بات نہیں
کرتا۔ ہم سب گھر میں کھلے دروازوں سے باہر نہیں نکلتے۔ ہمارے چاروں
طرف آواز آتی ہے، چیخیں آتی ہیں، گولیاں چلتی ہیں۔ ہم سب اپنے گھروں
میں کھلبلی میں ہیں۔" (۱۵)

یہ اقتباس دہشتگردی کے باعث پیدا ہونے والی خوف اور بے چینی کی ایک عکاسی ہے۔ یہاں کردار کی آواز میں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ شہر میں دہشتگردی نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے، جہاں لوگ گھروں میں قید ہو چکے ہیں اور باہر نکلنے سے خوف محسوس کرتے ہیں۔ چیخیں، گولیاں، اور شور یہ سب دہشتگردی کی خوفناک حقیقت کی علامات ہیں۔ اسی افسانے میں ایک اور اقتباس ملتا ہے۔ یہ اقتباس بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ دہشتگردی نے لوگوں کی زندگیوں کو کس طرح متاثر کیا ہے۔ یہاں کردار کی آواز میں احساس ہوتا ہے کہ لوگ نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ نفسیاتی طور پر بھی متاثر ہو چکے ہیں۔ ہر آواز پر کانپنا اور گھروں میں قید رہنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دہشتگردی نے انسانی نفسیات کو کس طرح برباد کیا ہے۔

اصغر ندیم سید کے افسانوں میں دہشتگردی کے اثرات کا تجزیہ کرنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں دہشت، خوف، اور تشویش کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں میں لوگ اپنے گھروں میں قید ہیں اور باہر نکلنے میں ہچکچاتے ہیں۔ چیخیں، گولیاں، اور شور یہ سب دہشتگردی کے باعث پیدا ہونے والی صورتحال کی علامات ہیں۔ یہ افسانے نہ صرف دہشتگردی کے اثرات کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی نفسیات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اصغر ندیم سید کا افسانہ "خوف کا منطقہ" ایک فکری اور تنقیدی کرب کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ سیاسی شعور کو بھی بیدار کرتے ہیں۔

نور الہدیٰ شاہ پاکستان کی معروف افسانہ نگار ہیں جن کے ادبی کاموں میں سماجی مسائل، نفسیاتی کشمکش اور سیاسی تناظر کو گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں دہشت گردی کے اثرات خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ پاکستانی معاشرے پر اس کے گہرے نقوش کو فنکارانہ انداز میں بیان کرتی ہیں۔ یہ مضمون ان کے افسانوں سے منتخب اقتباسات کی روشنی میں دہشت گردی کے سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی اثرات کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ نور الہدیٰ شاہ کے افسانوں میں دہشت گردی کو محض واقعاتی بیان تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف، بے چینی اور سماجی بکھراؤ کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ ان کے کردار اکثر اپنی شناخت، ایمان اور انسانیت کے بحران سے دوچار نظر آتے ہیں، جو دہشت گردی کے طویل المدتی اثرات کی عکاسی کرتے ہیں:

"شہر کی گلیاں اب خوف کی چادر اوڑھے سوتی ہیں۔ ہر چہرے پر ایک سوال
ہے: کل کس کا گھر اجڑے گا؟ ہم نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، مگر کانوں
میں دھماکوں کی گونج کبھی ختم نہیں ہوتی۔"(۱۶)

اس اقتباس میں دہشت گردی کے بعد کے ماحول کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔ "خوف کی چادر" اور "دھماکوں کی گونج" جیسے استعارے معاشرے پر مسلط ہونے والی خاموش دہشت کو ظاہر کرتے ہیں۔ کرداروں کی بے حسّی اور مستقبل کے متعلق عدم یقینی، دہشت گردی کے نفسیاتی اثرات کو اجاگر کرتی ہے۔ یہاں مصنفہ نے دہشت گردی کو ایک مستقل سماجی المیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ اپنے افسانے "ٹوٹا ہوا آئینہ" میں رقم طراز ہیں:

"وہ مسجد کے ملبے تلے سے نکالا گیا تو اس کی آنکھوں میں نمازیں گم تھیں۔
کہنے لگا: 'خدا نے ہمیں آزمایا ہے۔' مگر میں نے اس کے ہونٹوں پر ایک اور
سوال پڑھا: 'کیوں؟'"(۱۷)

دہشت گردی کے مذہبی استعاروں کو اس اقتباس میں نمایاں کیا گیا ہے۔ کردار کا ایمان اور شک کے درمیان تذبذب، دہشت گردی کے نام پر مذہب کے غلط استعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "کیوں؟" کا سوال مصنفہ کے اس موقف کو ظاہر کرتا ہے کہ دہشت گردی نہ صرف انسانی جانوں کو نگلتی ہے بلکہ ایمان کی بنیادوں کو بھی متزلزل کرتی ہے۔ ان کے افسانے "سرخ گلاب" میں جب بچی اپنی گڑیا کو سینے سے لگا کر کہتی ہے کہ امی کہتی ہیں دہشت گرد مر جاتے ہیں لیکن ان کا خوف باقی رہتا ہے اور وہ خوف کبھی نہیں مرتا تو مصنفہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ کیا ہم سب میں ایک دہشت گرد موجود ہے؟ یہ افسانہ دہشت گردی کے اثرات کی نسل در نسل منتقلی کو موضوع بناتا ہے۔ بچی کا معصومانہ سوال دراصل اجتماعی لاشعور میں پیوست خوف کی عکاسی کرتا ہے۔ مصنفہ کا سوال "کیا ہم سب کے اندر کوئی دہشت گرد زندہ ہے؟" انسانی فطرت میں موجود تشدّد کے امکانات پر غور کرتا ہے نور الہدیٰ شاہ کے افسانوں میں دہشت گردی کے اثرات کو کثیر الجہتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ نہ صرف دھماکوں اور خونریزی کی کہانی سناتی ہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی انتشار، مذہبی تشکیک اور نفسیاتی زخموں کو گہرائی سے اجاگر

کرتی ہیں۔ ان کے کردار اکثر اپنی شناخت اور ایمان کے بحران میں گھرے ہوتے ہیں، جو دہشت گردی کے طویل المدتی اثرات کی علامت ہیں۔ مزید یہ کہ وہ دہشت گردی کو محض بیرونی حملہ آور تک محدود نہیں سمجھتیں، بلکہ معاشرے کے اندر موجود خوف، تعصب اور تشدد کی صلاحیت کو بھی اس کا حصہ گردانتی ہیں۔ ان کا ادب ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دہشت گردی صرف بمباروں تک محدود نہیں، بلکہ اس کے اثرات ہماری نفسیات اور تہذیب میں گہرے تک سرایت کر جاتے ہیں۔

پاکستانی اردو افسانہ نگاروں نے دہشت گردی کو محض موضوع کے طور پر نہیں بلکہ ایک مکمل انسانی المیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہر افسانہ نگار کا زاویہ مختلف ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہشت گردی ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت مسئلہ ہے۔ دہشت گردی کا ادب پر گہرا اثر ہوتا ہے، خاص طور پر پاکستانی اردو افسانہ نگاری میں یہ موضوع انسانی المیے، نفسیاتی پیچیدگیوں اور سماجی بکھراؤ کے تناظر میں بار بار ابھرتا ہے۔ پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی صرف خون خرابہ تک محدود نہیں، بلکہ یہ انسان کے روحانی وجود کو جھلس دیتی ہے۔ منٹو کے کرداروں کی دنیا تشدد اور عدم استحکام سے تباہ ہوتی ہے، جہاں انسانی رشتے پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ وہ دہشت کے بعد کے سماج میں پنپنے والے خوف، بے اعتمادی اور ذہنی کرب کو ایسے بیان کرتے ہیں جیسے یہ سب ان کے اپنے وجود کا حصہ ہو۔ محمد حمید شاہد اپنے افسانوی مجموعہ "مرگزار" میں دہشت گردی کو انسانی مسئلے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دہشت گردی صرف موت کا سامنا نہیں، بلکہ زندہ بچ جانے والوں کا "سانس لیتے رہ جانا" ہے۔ یہ کردار جیتی جاگتی لاشوں کی مانند ہیں جو نفسیاتی طور پر مُردہ ہو چکے ہیں۔ حمید شاہد کی تحریریں اس بات کی عکاس ہیں کہ دہشت گردی کے گہرے زخم معاشرے کی رگوں میں اتر جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی 'اصغر ندیم سید اور نور الہدیٰ شاہ کے ہاں دہشت گردی سے جنم لینے والا خوف، بے چینی اور سماجی انتشار مرکزی موضوع ہے۔ ان کے کرداروں کی آوازوں میں وہ کھوکھلا پن، ڈر اور تشویش صاف محسوس ہوتی ہے جو شہری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ یہ افسانہ نگار دکھاتے ہیں کہ دہشت گردی نے نہ صرف شہروں کو بلکہ انسانوں کے ذہنوں کو بھی محصور کر لیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں یہ المیہ سماجی انتشار، اقدار کے زوال اور نفسیاتی تکلیفوں کے سنگم پر کھڑا نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ افسانہ نگار دہشت گردی کو محض ایک واقعہ نہیں بلکہ "انسانی شناخت کے بحران" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ سرحدوں کی تقسیم نے جہاں جغرافیہ کو پارہ پارہ کیا، وہیں ذہنوں کو بھی پاگل پن کی دہلیز تک پہنچا دیا۔ یہ ادب ہمیں بتاتا ہے کہ دہشت گردی کا طویل المدتی اثر صرف تباہی نہیں، بلکہ انسان کی روحانی موت ہے۔

حوالہ جات

۱. سعادت حسن منٹو۔ سیاہ حاشیے۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۹۰ء۔ ص ۴۵
۲. ایضاً۔ ص ۵۰
۳. سعادت حسن منٹو۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء۔ ص ۳۲
۴. سعادت حسن منٹو۔ دھواں۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۲

۵. احمد ندیم قاسمی۔ گھر سے گھر تک۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔ ص ۲۵
٦. احمد ندیم قاسمی۔ کپاس کا پھول۔ کراچی: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء۔ ص ۳۷
۷. احمد ندیم قاسمی۔ سناٹا اور دوسرے افسانے۔ لاہور: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۰ء، ص ۵۴
۸. حسن منظر۔ ٹکٹاک۔ "مشمولہ "شہر بے مثال۔ اسلام آباد: کتاب پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۴۷
۹. حسن منظر۔ خون کے آنسو۔ "مشمولہ "خواب اور خوں۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۲۰۱۵ء۔ ص ۵۴
۱۰. حسن منظر۔ شہر بے مثال۔ ص ۱۰
۱۱. محمد حمید شاہد۔ مرگ زار۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔ ص ۲۳
۱۲. ایضاً۔ ص ٦٦
۱۳. ایضاً۔ ص ۳۴
۱۴. ایضاً۔ ص ۱۱۲
۱۵. اصغر ندیم سید۔ جلتے پہاڑوں کی نیند۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔ ص ۲۳
۱٦. نورالہدیٰ شاہ۔ زخموں کی گھڑی۔ لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۵ء۔ ص ۴۷
۱۷. نورالہدیٰ شاہ۔ اپردے کی آواز۔ کراچی: کتاب پبلیکیشنز، ۲۰۱۸ء۔ ص ۹۲